مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
ایک صاحبِ طرز اسلوب نگار

ڈاکٹر محمد جاوید اصغر

مولانا سید ابوالاعلی مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) بنیادی طور پر نثر نگار ہیں۔ انھوں نے سنجیدہ مذہبی، علمی، سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل وموضوعات پر اظہار خیال کرنے کے لیے اردو ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ دورِ جدید میں اردو نثر کے علمی اسلوب کے بہترین نمایندے قرار پاتے ہیں کہ ان کی نثر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن سے اردو نثر کا علمی اسلوب عبارت ہے۔

اسلوب کی اہمیت

کسی نثر پارے میں اس کا اسلوب بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا اس کا مواد اور موضوع۔ اصل کمال یہ ہے کہ فن کار ہر لفظ کو بالکل اس کے صحیح مقام پر اور پوری دلالتوں کے ساتھ استعمال کرے۔ لفظوں کا برمحل استعمال ہی طرز تحریر میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں: ''بات صرف ایک ہی انداز سے بہترین طریقے سے ادا ہوسکتی ہے، اور نثر نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اس طرز کو تلاش کرے''[۱] گویا اسلوب کی انفرادیت خیال یا جذبات کی انفرادیت سے نہیں، بلکہ موزوں الفاظ کے انتخاب، ان کے استعمال اور طرز اظہار کی انفرادیت سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بات خواہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو، جب تک اچھے طریقے سے نہ کی جائے دلوں اور ذہنوں پر اپنا اثر مرتب نہیں کرسکتی۔ اچھا فن کار لفظ ومعنیٰ پر قدرت حاصل کر کے انھیں مناسب ترتیب کے ساتھ دوسروں تک پہنچاتا ہے، جس سے اس کا انفرادی اسلوب وجود میں آتا ہے اور

وہ اسلوب اس کی شخصیت کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلوب مصنف کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے یا مصنف کی مکمل شخصیت کا دوسرا نام اسلوب ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اپنے کلام یا تحریر سے پہچانا جاتا ہے اور ہر شخص کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز مختلف ہے۔ اس لیے اسلوب میں ہمیں لفظوں کی ترتیب کے پیچھے فن کار کی شخصیت بھی نظر آتی ہے۔ اور شخصیت میں اس کی ذات کے سارے زاویے شامل ہوتے ہیں۔ اس کا نصب العین، اس کا مقصد حیات، اس کا مزاج، اس کی عادات، اس کا اخلاق، طرزِ عمل اور عام شخصی رویہ، سب مل کر جو شخصیت کو پروان چڑھاتے ہیں اور وہی اس کے اسلوب میں منعکس ہوتے ہیں۔ صرف شخصیت ہی نہیں بعض اوقات مصنف کا ماحول، اس کا موضوع اس کا مقصد مل کر اس کے اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کا لب و لہجہ موقع و محل، فضا کی تبدیلی، مضمون اور موضوع کی نیرنگی کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں: ''اسٹائل صرف خارجی خصائصِ تحریر کا نام نہیں، بلکہ مصنف کی شخصیت کے داخلی نقوش اور اس کا طرزِ مشاہدہ ہی نہیں، بلکہ اس کا طرزِ احساس، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مصنف کے زمانے کی قوم، بلکہ اس کی پوری تہذیب کے نقوش کا نام ہے''۔[۲]

ادبیات عالم میں بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ہمیشہ بہترین اسالیب اختیار کیے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس سے صرف جذبوں کی تسکین نہیں ہوتی، بلکہ عقل کو بھی طمانیت ملتی ہے۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ہے: ''اچھی نثر اور اچھے اسلوب کی پہچان یہی ہے کہ مصنف کے پاس کہنے کے لیے جو کچھ بھی ہو، اسے زیادہ سے زیادہ واضح طور پر ظاہر کر سکے۔ عبارت میں تصنع اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نثر نگار کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو''۔[۳]

نثر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ترسیل علم کا کام دیتی ہے اور اس کے ذریعے سماجی مقاصد پورے کیے جاسکتے ہیں، جو اس خاص زمانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

اس لیے صاحب طرز ادیب اجتماعی علوم پر مشتمل تصانیف تخلیق کرتے ہوئے بھی اپنا رنگ اور انداز متعارف کرا دیتے ہیں۔

اردو نثر کی تاریخ پر ایک نظر

اردو برصغیر ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی میں بول چال کی زبان تھی۔ اس کا بیش تر ادبی سرمایہ شاعری تک محدود تھا۔ اردو نثر کے دور اوّل کی اکثر کتابیں مذہبی مباحث پر مبنی ہیں۔ صوفیہ کرام نے دین متین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جو زبان استعمال کی وہ اگرچہ بازار بھاٹ کی زبان تھی، لیکن انھوں نے سلوک و معرفت کے بڑے بڑے نکتے آسان اسلوب میں سمجھا دیے۔ بہ قول مولوی عبدالحق: ''اردو کی ابتدائی تصانیف کا محرک اسلام کے عقائد اور تصوف کے مسائل کو ہندوستان کے عوام اور خاص طور پر نومسلموں کو سمجھانے کی ضرورت اور خواہش تھی''۔[۴] اس مقصد کے لیے زبان صاف اور سادہ استعمال کی گئی اور مذہب و تصوف کی بہت سی اصطلاحات اردو زبان کا حصہ بن گئیں۔ صوفیہ کرام کے رسائل اور ملفوظات کے بعد قرآن کریم کے اردو تراجم سے اردو زبان نے علمی و ادبی راستوں کو پالیا۔ اسی عہد میں فضلی کی کربل کتھا تخلیق ہوئی جو ایک مذہبی کتاب تھی۔ اس میں جوشِ بیان اور شدت جذبات کے باوجود اظہار میں ایسا توازن ہے کہ اس کی نثر اس دور کی معیاری نثر قرار پائی''۔[۵]

اٹھارویں صدی تک اردو نثر دو جدا جدا دھاروں میں بہہ رہی تھی۔ ایک کا منبع قرآن کے تراجم اور مذہبی تعلیمات کے لیے لکھی جانے والی تخلیقات تھیں، جن میں سادگی اور اختصار کو ملحوظ رکھا گیا تھا اور دوسرے کا مآخذ سہ نثر ظہوری تھا، جس میں عبارت آرائی، قافیہ پیمائی اور مرصّع کاری کی پیروی کی جارہی تھی۔ اس اسلوب کا مقصد محض ایک طبقے کو تفریح بہم پہنچانا تھا، جب کہ مذہبی اسلوب کی سادگی کے پیش نظر اس کا مقصود عوام الناس کو مذہبی تعلیمات سے روشناس کرانا تھا۔ یوں مذہبی نثر کا یہ اسلوب عوامی مزاج سے قریب تر اور وقتی ضرورت کا متقاضی تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو نثر نے ایک کروٹ لی اور قصہ نگاری نے سلاست، سادگی اور سہولت اظہار کے لیے ایک بالکل نیا معیار قائم کر دیا۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر میں تفریح اور ضرورت کو باہم ملا دیا گیا تھا۔ عبارت سادہ اور غیر شاعرانہ تو ضرور ہوگئی اور میر امن اردو کے تفریحی ادب کو آسان لکھنا بھی سکھا گئے، جو اس سے قبل مذہبی ادب کی خصوصیت تھی، لیکن اظہار ذات کی راہ ابھی تک نہیں کھلی تھی [۶] اس کے بعد مرزا غالب نے اردو نثر کو خالص شخصی جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور مدعا نویسی پر نہ صرف زور دیا، بلکہ اس میں ادبی حسن بھی پیدا کیا، جو اپنی جگہ ایک منفرد تجربہ تھا، لیکن یہ کاملاً ذاتی اور شخصی تجربہ تھا''۔ [۷]

صحیح معنوں میں جدید اردو نثر کی داغ بیل شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب **تقویۃ الایمان** نے ڈالی، جس میں انھوں نے اردو کے ادیب کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی تربیت دی اور اردو نثر کو شخصی اظہار سے اجتماعی اظہار کی طرف راغب کرتے ہوئے نہایت سلیس و سادہ زبان استعمال کی۔ غلام رسول مہر کے خیال میں: ''اردو زبان نشوونما کے مزید مدارج طے کرنے کے بعد **تقویۃ الایمان** کو بہ لحاظ اسلوب اپنا ایک گراں بہا سرمایہ تصور کرے گی''۔ [۸] اس کتاب کی زبان دینی موضوع پر اظہار کے باوجود نہایت سادہ، شگفتہ، دل کش اور ادبیت سے معمور ہے۔ اردو زبان کے ابتدائی دور کی اس نثر پر رشک آتا ہے، کیوں کہ اس میں سادگی، سلاست، مدعا نویسی، اجتماعی قوت اور اظہار کی خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔ اسی لیے پروفیسر آسی ضیائی کہتے ہیں: ''سرسید کی پیش رو نثر نہ میر امن کی **باغ و بہار** ہے نہ رقعات غالب، بلکہ شاہ اسماعیل شہید کی کتاب **تقویۃ الایمان** ہے''۔ [۹] گویا اردو کی علمی نثر کو تقویت فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کے علاوہ شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے تراجم و تخلیقات سے بھی ملی اور ان کے ذریعے جدید اردو نثر کے لیے زمین ہموار ہوئی۔

اردو نثر کو سہل، سادہ، دل نشین اور ادبیت سے معمور لہجہ جہاں مذہبی تصانیف کی بدولت ملا، وہاں اردو نثر کی ترقی کے امکانات میں مسیحی مشنریوں اور ان کی تبلیغی اور اشاعتی

سرگرمیوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب میں سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کو فروغ اسی تحریک کی بدولت ملا۔ اسی عہد میں ''مذہب کا مطالعہ فلسفیانہ بنیادوں پر کرنے کے رجحان کا آغاز ہوا، قرآن کی عملی تعلیم پر توجہ دی گئی اور اردو نثر کے اطراف سے تصوف کا حصار ڈھایا جانے لگا''۔[۱۰]

اردو نثر کے ذریعے اجتماعی مقاصد پورے کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب کو سائنس اور فلسفے کی روشنی میں جانچنے کی مساعی شروع ہوئیں تو سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی نثر وجود میں آئی۔ سرسید نے اردو نثر میں نہ صرف علمی وفکری سلاست اظہار کی طرح ڈالی، بلکہ سائنٹی فک طرزِ اظہار کے رواج میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ، مذہب، تہذیب معاشرت، سیاست، ادب اور صحافت کے موضوعات پر اردو نثر میں عام فہم انداز میں لکھا جانے لگا۔ ''سرسید نے اردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنا دیا''۔[۱۱] سرسید نے اردو نثر کے دامن کو وسعت تو دی، لیکن جو اسلوب تخلیق کیا اس میں بے رنگ سادگی اور کرخت منطقیت ہے۔ البتہ حالی کی سادگی میں سرسید کی نسبت لطافت اور نفاست ملتی ہے۔ لیکن حالی کا استدلال شاعرانہ ہے، جو عقل کو متاثر نہیں کرتا۔ شبلی کی نثر میں چاشنی، دل کشی اور رعنائی ضرور ہے، لیکن ان کی تحریر میں شخصی عنصر ضرورت سے زیادہ داخل ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود شبلی کی نثر جمالیاتی حس اور استدلالی علمیت کی مظہر ہے۔ ان کی نثر میں خاص طرح کا نظم وضبط اور توازن پایا جاتا ہے۔ پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی کے الفاظ میں: ''شبلی کے ذریعے اردو نثر میں مذہبی احوال و افکار کی تعبیر وتشریح سے مذہبی دانش وری کی روایت کی توسیع ہوئی اور شبلی مذہب کے راستے صحن ادب میں داخل

☆ اردو نثر کی تاریخ کے ضمن میں مضمون نگار نے صرف چند ہی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے، بہت سی اہم شخصیات اور اداروں کے نام چھوٹ گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے فروغ میں مذہبی شخصیات اور علماء اور دینی اداروں کا غیر معمولی حصہ ہے۔ اس کا جائزہ لینے کے لیے الگ سے ایک مبسوط مقالہ کی ضرورت ہے۔ (معاون مدیر)

ہوئے''۔[۱۲] محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد وہ اسلوب اختیار نہ کر سکے جو سماجی مقاصد کی تکمیل اور اعلیٰ مقاصد کا ترجمان ہوتا ہے، تاہم انھوں نے اردو زبان کو خالص علمی منہاج عطا کیا۔

اردو نثر کی اس مجموعی کلاسیکیت اور سادہ نویسی کے خلاف ردعمل کے طور پر اردو میں رومانویت کی تحریک شروع ہوئی اور بنے بنائے فکری سانچے اس کی زد میں آ گئے۔ رومانوی طرز کے ادیبوں نے اردو نثر میں لطافت و رنگینی پیدا کی۔ ابوالکلام آزاد نے اپنے انداز تحریر سے اردو نثر کو وہ شکوہ عطا کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے علمی استدلال کی بجائے الفاظ کا جادو جگا کر قاری کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی اور جذبات سے دلیل کا کام لیا۔ یہ درست ہے کہ اردو نثر میں مولانا آزاد کا اسلوب اپنی تازہ کاری کی وجہ سے ایک خاص درجہ رکھتا ہے، لیکن عربی و فارسی تراکیب سے مزین اسلوب تجزیاتی ہنر سے خالی ہے۔☆

اردو نثر کے اسالیب مولانا مودودی سے قبل

اگر ہم اردو نثر کے اسالیب کے حوالے سے اس عہد پر نظر ڈالیں تو مولانا مودودی سے پہلے اردو نثر میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک اسالیب نثر میں چار واضح روایات نظر آتی ہیں۔ ایک روایت کا حامل وہ دینی ادب ہے جسے روایتی علما نے تیار کیا تھا۔ اس میں زبان کی صحت کا تو پورا اہتمام ملتا ہے، مگر اسلوب کے حسن کی زیادہ فکر نہیں کی جاتی تھی، بلکہ اصل اہمیت مواد اور معنی کو حاصل تھی۔ اس دینی ادب کا موضوع چوں کہ خالصتاً مذہبی مسائل تھے، اس لیے ان میں مذہبی اصطلاحات کا استعمال بہ کثرت ملتا ہے، جس کی وجہ سے یہ انداز تحریر خاصا مشکل اور بوجھل ہو گیا تھا۔ اردو نثر کی یہ روایت خالص مذہبی حلقوں میں ہی مقبول تھی، عوام الناس مشکل نثر کے سبب اس سے کم ہی استفادہ کر سکتے تھے۔ دوسری روایت کے بانی سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے دینی ادب کی روایت سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی اور اردو نثر کو اصلاحی تحریک کا ترجمان

بناتے ہوئے سادہ اور صاف ستھری نثر لکھی۔ انھوں نے مغربی ادب سے بھی استفادہ کیا اور خالص مذہبی امور کے ساتھ تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور علمی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی۔ بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''مذہبی تحریروں میں معقولات سے استفادہ کرنا اردو میں سرسید اور ان کے رفقا کی خصوصیت ہے۔ سرسید کی تحریر کا ایک بنیادی وصف ان کا منطقی اعتبار سے مربوط ہونا ہے''۔[۱۳] تحریک سرسید سے منسلک ہونے کے باوجود شبلی کی نثر کے اسلوب کی رنگینی، سنجیدگی، تمکنت اور رعنائی انھیں سرسید اور ان کے رفقا کے اسلوب سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے مذہبی نثر کی زیادہ حسین اور متوازن روایت قائم کی ہے۔ اردو نثر کو عربی اور فارسی ادب کے جان دار اجزا سے مالا مال کیا ہے، لیکن ان کا اسلوب کسی مشن کے لیے آدمی کو ابھارنے میں معاون نہیں ہوسکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان تینوں روایات سے ہٹ کر اردو نثر کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کیا۔ ان کی نثر کی بنیادی خصوصیت خطابت اور رومانویت ہے، لیکن جدید ذہن اس اسلوب سے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے ان کی علمی و مذہبی نثری روایت ان کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔

ان چاروں روایات سے ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں جن ادیبوں نے اردو نثر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، یا اردو نثر کے دامن کو اسالیب، لہجوں اور الفاظ و تراکیب کے اعتبار سے وسعت دی وہ زیادہ تر وہی ادیب تھے جن کا موضوع مذہب تھا، یا جنھوں نے اجتماعی مقاصد کے لیے اردو نثر کو اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک اردو نثر کی یہ روایات مولانا مودودی کی نظر میں تھیں۔ انھوں نے ان چاروں روایات سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے مثبت عناصر کو اپنے اسلوب میں جمع کیا اور پھر ایسا جان دار اسلوب تخلیق کیا، جس نے اردو نثر کے اسالیب میں پانچویں روایت کو پروان چڑھایا۔ یہ اسلوب، جسے مودودی اسلوب کہا جاسکتا ہے، مذہبی، علمی، فکری اور ادبی روایات کا خوب صورت امتزاج ہے۔

مولانا مودودی کے اسلوب کے ارتقائی ادوار

مولانا مودودی نے ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ اپنی ادبی زندگی کا سفر شروع کیا۔ انھوں نے ابتدا میں مختلف تراجم کیے، لیکن صحافت سے ان کی قلمی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا اور پھر یہ سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا۔ اس دوران میں انھوں نے تاریخ نویسی کی، قرآن کریم کی سہل، سادہ اور علمی تفسیر پیش کی، سیرت نبوی پر خامہ فرسائی کی۔ ان کے علاوہ دیگر پہلوؤں پر بھی علمی انداز میں کام کیا۔ ان کے قلمی سفر میں ان کے اسلوب کے مجموعی رنگ کو ہم سلاست سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن یہ اسلوب ارتقاء پذیر ہوتا رہا ہے۔ اس کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی ابتدائی تحریروں میں سرسید، حالی، شبلی اور ابو الکلام آزاد کے اثرات موجود ہیں۔ ان میں سادگی، عربیت، جوش، خطابت، زورِ بیان اور تخیل کی کارفرمائی موجود ہے، لیکن منطقیت اور استدلال کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ سیرت النبی کے موضوع پر ۱۹۱۵ء میں انھوں نے جو مضمون لکھا تھا، وہ سادہ، آسان اور سہل تو ضرور ہے، لیکن اس میں بعض مشکل تراکیب اور عربی الفاظ نظر آتے ہیں، جیسے صحت اور تدقیق، عقیل وفہیم، شرک وتمرد، حقیقی مبحث، عقربیت، تغلیط وغیرہ، البتہ بحث کا تجزیاتی انداز اس تحریر میں بھی نظر آتا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

> ''اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ۱۳ برس کی عمر میں حضرت اسماعیلؑ حضرت ہاجرہ کے کاندھے پر بیٹھے ہوئے نکالے گئے۔ اور یہ کسی طرح یقین نہیں کیا جاسکتا کہ تیرہ برس کا لڑکا اتنا چھوٹا ہو کہ ایک عورت اس کو اٹھا کر طویل سفر کرے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ توراۃ میں یہ واقعہ بالکل گھڑ کر لکھا گیا ہے''۔[۱۴]

مولانا مودودی نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ایک مضمون **برق یا کھربا** کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس مضمون کا موضوع خالصتاً سائنسی تھا، لیکن اوائل عمر میں سائنسی موضوع پر اردو نثر میں بہت خوب صورت انداز میں مضمون لکھ کر انھوں نے اپنے قادرالکلام ہونے کا ثبوت دیا۔ یہ مضمون بھی مشکل اسلوب کی مثال ہے۔ مشکل پسندی کا ایک سبب تو

موضوع کا تقاضا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ اردو نثر میں مذہبی موضوعات پر لکھنے کے لیے الفاظ تو میسر تھے، لیکن خالصتاً سائنسی موضوعات پر لکھنا اس قدر آسان نہ تھا۔ مولانا نے اس مضمون میں مچھلیوں کے نام عربی زبان میں لکھتے ہوئے یہ معذوری ظاہر کی کہ ''افسوس اردو میں ان کے کوئی نام نہیں''۔ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں: ''اردو میں سائنسی عبارت کو ادا کرنے کی یہ روشن مثال ہے''۔[۱۵] اس مضمون میں بہت سی نئی تراکیب بھی وضع ہوئی ہیں، مثلاً: بندۂ بے دام، کامل کار، رفع ضرورت، اقتضائے قدرت الٰہی، کلید سفر برّی و بحری، تعجب و تحیر، جولان گاہِ تخیل۔

اسلوب کے ارتقائی سفر میں مشکل اسلوب کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''یورپ کے اختراعاتِ دماغیہ، جنھوں نے آج ایک عالم کو محوِ حیرت بنا دیا ہے، سائنس کی وہ ترقیاں جن کا کل کسی کو گمان تک نہ تھا، آج ہماری سامعہ ان سے متحیر اور ہماری باصرہ ان سے متعجب ہے''۔[۱۶]

۱۹۲۰ء کی ایک تحریر کا آغاز جن الفاظ سے ہوتا ہے ان کے پس منظر میں شبلی کی رنگینیِ خیال اور ابوالکلام آزاد کی خطابت و رومانویت صاف نظر آتی ہے۔ جوش و جذبہ، ولولہ اور بلند آہنگی کا یہ رنگ مولانا کی صرف ابتدائی تحریروں میں ہی پایا جاتا ہے:

''آہ، میں کیوں کر خون شدہ دل کو سمجھا لوں کہ وہ تو کسی مسلمان کو اتنا بے حمیت ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میری تمھاری شناسائی تو ایثار و قربانی کے صدیق اور فاروق نے کرائی تھی۔ میں نے تم سے صرف آٹھ لاکھ روپیا مانگا ہے، اگر تم چاہو تو یہ رقم ایک ہفتے میں جمع کر کے وہاں بھیج سکتے ہو''۔[۱۷]

مولانا مودودی نے مصطفیٰ کامل پاشا کی زندگی پر جو مضمون لکھا اس کے بیش تر جملوں میں ابوالکلام آزاد کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ وہی طنطنہ، جوش، خطابت، رومانویت، مشکل پسندی اور استعاراتی رنگ ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''آج ۶۱ برس کی پُرانقلاب مدت گزر جانے کے بعد بھی جب آلِ فراعنہ کے سامنے یہ نام [مصطفیٰ کامل پاشا] لیا جاتا ہے تو وہ وجد میں آ جاتے ہیں۔ ان کی

آنکھوں میں وہ زمانہ پھر جاتا ہے جب اس نام کے ایک دبلے پتلے، ضعیف الجثہ نوجوان نے اوّل اوّل انھیں ہوش کی دوائی سنگھائی تھی، جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا اور طلب واستقلال کی ایسی تند و تیز شراب پلادی تھی جس کا نشہ سخت سے سخت ترشیوں کے باوجود آج تک برابر بڑھتا ہی جارہا ہے۔ وہ شخص دراصل مصر کا اوّلین داعی حریت تھا''۔ [۱۸]

سید ابو الخیر کشفی کے الفاظ میں: ''مصطفیٰ کامل پاشا کے سوانح پر مودودی صاحب کے طویل مقالے کے کتنے فقروں اور جملوں پر مولانا آزاد کے اسلوب کی چھاپ موجود ہے''۔ [۱۹]

مولانا مودودی کے ابتدائی اسلوب میں شبلی اور ابو الکلام آزاد کے اسلوب کی چھاپ کا بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے بچپن میں تاریخ کے موضوع پر شبلی کی لکھی ہوئی کتابوں اور الہلال کو تواتر کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ ان کے اسلوب سے متاثر بھی ہوئے تھے، اس لیے ان کے ابتدائی اسلوب میں ''دو زیریں لہریں ہمیں متوجہ کرتی ہیں اور یہ دونوں لہریں ایک دوسرے سے نبرد آزما نظر آتی ہیں: ایک شبلی کا اسلوب، دوسری ابوالکلام کا اندازِ نگارش''۔ [۲۰]

۱۹۱۷ء کے بعد ابتدائی تین چار برسوں میں مولانا مودودی کو جس کا انداز تحریر پسند آتا، غالباً وہ اس کی نقل کی کوشش کرتے، لیکن مطالعہ میں اضافہ کے ساتھ انھوں نے محسوس کیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا نہیں، بلکہ اپنا مستقل انداز تحریر اختیار کرنا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ادیب کے ابتدائی اسلوب میں دوسروں کے اسلوب کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اور یہ کوئی خامی نہیں، کیوں کہ ممتاز حسین کے خیال میں: ''ذہنی تخلیق انفرادی اسلوب کو جنم تو ضرور دیتی ہے، لیکن اس کا قطعی مطلب نہیں کہ اس انفرادیت میں ہم عصر فن کاروں کی تخلیقات کی کوئی مشترکہ قدر موجود نہ ہو''۔ [۲۱]

مولانا مودودی کی وہ تحریریں، جو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک لکھی گئی ہیں، ہنگامیت اور صحافت کے تقاضوں کے باوجود اپنے اندر سلاست، استدلال، دل کشی، شگفتگی اور

رعنائی کی خوبیاں رکھتی ہیں۔ اس دور کی تحریروں میں سادگی و پرکاری ہے۔ ۱۹۲۴ء کے بعد ان کے ہاں سادگی، سلاست اور روانی ایک مستقل اسلوب فن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے اسلوب میں ارتقا کی جو صورت نظر آتی ہے اس میں یہ بات سب سے نمایاں ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر اپنی تحریروں کو سادہ، سلیس، رواں، دلچسپ، عام فہم اور دل نشیں بنانے کی کوشش کی ہے۔ اسلوب میں شعوری طور پر سادگی کی طرف مراجعت کے سلسلے میں پروفیسر فروغ احمد لکھتے ہیں:

''اغلب تھا کہ سید مودودی بھی نثرِ ابو الکلام آزاد کی روش پر چل نکلتے، لیکن انھوں نے اپنے بے پایاں جذبۂ اظہار کے باوجود خطابت کی تند و تیز روش اختیار کرنے کی بجائے سنگ ریزوں کو سڈول بنانے اور آبادیوں کو سیراب کرنے والے نرم رو دریا کے بہاؤ کو اپنے لیے پسند کیا''۔[۲۲]

مولانا مودودی کی ابتدائی تحریروں کے اسلوبیاتی مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے تراجم میں بھی ترجمے کی اصل روح کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ تاریخ لکھتے ہیں تو اس میں دل کشی پیدا کر دیتے ہیں، صحافت علمیت کے ساتھ مل کر ان کے ہاں نئے علمی اسلوب کو اجاگر کرتی ہے۔ خطوط موضوعاتی تنوع اور اسلوب کی جاذبیت لیے ہوئے ہیں اور تبصرے محض عبارات آرائی کے ذیل میں نہیں آتے، بلکہ قاری پر کتاب کی اصلی معنویت عیاں کرتے ہیں۔ وہ موزوں ترین خیال کے لیے بہترین لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے موزوں الفاظ وہی ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بہ خود چلے آتے ہیں، لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیے''[۲۳]

مولانا مودودی کے خیالات میں تنوع ہے، اس لیے ان کے اسلوب میں بھی بہت وسعت ہے۔ وہ مولوی نذیر احمد، حالی، شبلی یا ابوالکلام آزاد کی طرح ہر موضوع کے لیے ایک ہی اسلوب اختیار نہیں کرتے، بلکہ ہر موضوع کے حسب حال انداز تحریر اپناتے

ہیں۔ان کے ہاں دو اسالیب بہت واضح طور پر جدا جدا پائے جاتے ہیں۔ایک ان کی جوانی کا دور ہے، جس میں روانی اور زورِ بیان اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس میں بھی اگرچہ استدلال اور سنجیدگی تو ہے، مگر شعلے کی سی لپک اور طوفان کا سا دبدبہ بھی ہے، جب کہ دوسرے دور میں اعتماد اور ٹھہراؤ کی فضا ملتی ہے''۔[۲۴]

الجہاد فی الاسلام پہلے دور کی کتاب ہے۔اس دور میں مولانا مودودی کے ہاں ڈاکٹر عبدالمغنی کے الفاظ میں ''الفاظ کی سادگی، بیان کی روانی، نکات کی برجستگی، بحث کی منطقیت، تجزیاتی انداز اور ترتیبِ اظہار نمایاں ہے''۔[۲۵] اس کتاب میں ان کے اسلوب کی جملہ خوبیاں اس انداز میں سامنے آتی ہیں کہ پڑھنے والا تحریر کی صداقت، وضاحت، قطعیت اور استدلال سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے، بلکہ شکوک وشبہات کی دنیا سے گزر کر یقین اور صداقت کے جہاں میں داخل ہو جاتا ہے۔ان کا مقصد اس عہد کے مروّجہ افکار کی تنقیح کر کے مسلمانوں کے اندر اعتماد پیدا کرنا اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنا تھا۔اس لیے اس دور میں اُن کے اسلوب میں منطقی انداز، نکتہ آفرینی، سلاست، روانی، طرزِ اظہار میں تاثیر، جدت کے ساتھ ادبی پختگی، محاورات کی چستی، مزاح کی چاشنی اور ابلاغ کی رعنائی ملتی ہے۔ان کی عام فہم تصانیف دینیات اور خطبات اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں اور اسی زمانے میں سود اور پردہ بھی تصنیف کی گئی تھیں۔یہ مولانا مودودی کا کمال ہے کہ وہ اپنے مخاطب، موضوع اور مواد کی ترتیب سے ایسا بے ساختہ، برجستہ اور ادبی خوبیوں سے مزین اسلوب تشکیل دیتے ہیں کہ قاری موضوع اور اسلوب دونوں کا بیک وقت لطف لیتا ہے۔

مولانا مودودی کے اسلوب کا تیسرا دور تیس سال کے طویل دورانیے پر مشتمل ہے۔اس میں وہ ایک صاحب طرز ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کے اسلوب کا کلاسیکی پہلو نمایاں ہونے لگتا ہے۔ سادگی و پرکاری، ادبی نفاست، استدلال، اعتماد، اعتدال، قطعیت، حرکیت، فعالیت، جامعیت، فصاحت، بلاغت، علمیت، ایجاز، اطناب، ذکاوت، شگفتگی، طنز اور اس طرح کے دیگر ادبی محاسن اردو اسلوب کی نئی روایت کو جنم

دیتے ہیں۔ ایک طرف تو سہل ممتنع کی نثری روایت ارتقائی شکل میں ڈھلتی ہے تو دوسری طرف اپنے اندر ادبی محاسن بھی رکھتی ہے۔ اس آخری دور میں مولانا مودودی کے اسلوب کی یہ روایت اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔ مڈلٹن مرے نے جو یہ کہا تھا کہ ''بہترین اسلوب وہی ہے جس میں صاحب قلم مضمون کی معنویت میں اتنا سرشار ہو کر لکھے کہ اسے خیال بھی نہ آئے کہ وہ کوئی اسلوب تخلیق کر رہا ہے''[۲۶] اس رائے کا حقیقی معنوں میں اطلاق مولانا مودودی کی ادبی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پیش نظر نہ تو عبارت آرائی تھی، نہ قصہ گوئی، نہ انانیت سے مرعوب کرنے کی تمنا، وہ تو مضمون کی معنویت میں ڈوب کر ایسا اسلوب تخلیق کر رہے تھے جو ان کے پیش رو قلم کاروں کے اسلوب کی ارتقائی بلکہ مکمل شکل تھا۔ اس میں سرسید کے اسلوبِ بیان کی وضاحت وصراحت، حالی کے اندازِ بیان کی سادگی و بے ساختگی، نذیر احمد کی برجستگی، آزاد کی شگفتگی، شبلی کی ہمواری اور ابوالکلام کی طرفگی و رعنائی کے ساتھ پُر اثر نثر کے تمام اجزا موجود ہیں۔[۲۷]

مولانا مودودی نے مکمل اور زندہ اسلوبِ نثر تخلیق کیا ہے، جو روایت سے بھی جڑا ہوا ہے اور اپنی انفرادی شان بھی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے:

> ''مولانا کی نثر اپنا ایک خاص انفرادی رنگ رکھتی ہے۔ مشکل مسائل کو سیدھے سادے انداز میں پیش کرنے کا جو ڈھنگ انھیں آتا ہے، اس سے ان کی نثر ایک عام قاری کو اپنی طرف اسی شدت سے کھینچتی ہے جس شدت سے ایک عالم کو۔ انھوں نے ہماری اردو نثر کی روایت میں یہ انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے کہ اسے دینی نثر کے عام اسلوب سے الگ کر کے عام پڑھنے والوں کے لیے یک گونہ سہولت پیدا کر دی ہے۔ اردو ادب میں دینی سرمایے کو بیان کرنے کے لیے جو عربی آمیز ڈھنگ اختیار کیا گیا، اس میں ایک خاص طرح کا مولویانہ رنگ نمایاں رہا ہے، لیکن مولانا کی نثر میں ایک ادبی شان پائی جاتی ہے۔ وہ بلاشبہ اردو کے صاحب طرز نثر نگار تھے''۔[۲۸]

مولانا مودودی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات

مولانا مودودی نے اردو نثر کے اسالیب کے مختلف اجزا کو جذب کر کے ایک نیا اسلوب تشکیل دیا ہے، جس میں اردو نثر کی دینی، علمی، فکری، ادبی اور دانش وارانہ روایت کے سارے رنگ جمع ہو کر 'اسلوب مودودی' میں ڈھل گئے ہیں۔ اس کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱- مقصدیت

مولانا مودودی کے اسلوب کی سب سے اہم خوبی مقصدیت ہے۔ یہ عنصر بے حد اہم اس لیے ہے، کیوں کہ مقصد بدل جانے سے اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ دنیا کا عظیم ادب کسی مقصد کے تحت ہی وجود میں آیا ہے اور مولانا مودودی، جن کے نزدیک ادب دماغوں کو ڈھالنے والی قوت ہے، ان کے ہاں اسلوب میں مقصدیت لازمی تھی۔ ان کی تحریر میں مقصدیت جب ربط و تنظیم، منطقی ترتیب، اور سلاست و سادگی کے ساتھ سامنے آتی ہے تو قاری کے سامنے بھی وژن بالکل نمایاں ہو جاتا ہے اور وہ بھی زندگی کے محدود تصور اور دائرے سے باہر نکل کر راہ عمل پر گام زن ہونے کے لیے آمادہ نظر آتا ہے۔ پھر وہ زندگی کو ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں دیکھتا، نہ کوئی جزوی اصلاح یا ترمیم اسے مطمئن کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے مقابلے میں سید مودودی کی فکر زیادہ توانا اور مربوط تھی، جس نے ایک طاقت ور ڈائنا مائیٹ کی طرح مادیت، الحاد پرستی پر مبنی نظریات اور فلسفے کی چٹانیں ریزہ ریزہ کر دیں۔ اسی مربوط فکر نے انھیں توانا اور مقصدی اسلوب عطا کیا''۔ [۲۹]

۲- اعتماد اور قطعیت

زندگی کے بارے میں مولانا مودودی کے واضح نصب العین نے ان کے ہاں جہاں فکری نظم و ضبط پیدا کیا ہے وہیں ان کی تحریر میں اعتماد، قطعیت اور تیقن کی خصوصیات

بھی پیدا کی ہیں۔ ان کے اسلوب کی قطعیت قرآن کے وسیع مطالعے، غور وفکر اور تدبر کی عادت، نیز اپنے نصب العین پر کامل یقین کی بدولت ہے۔ ان کی تحریریں تشکیک، مایوسی، فکری انتشار اور گومگو کی کیفیت سے بالکل پاک ہیں۔ ان کی شخصیت کا اعتماد، تیقن اور فکری پختگی ان کے اسلوب میں بڑی رعنائی اور دل کشی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ کیٹس نے کہا تھا:

''اسلوب کی صراحت اور طرز ادا کی قطعیت ہی ادیب کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے''۔[۳۰]

مولانا مودودی کے خیالات میں کہیں ابہام نہیں ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہتے ہیں۔ ان کے یہاں 'یہ بھی اور وہ بھی' کا رنگ نہیں پایا جاتا۔ اس لیے ہم ان کی کسی بات سے کوئی دوسرا مفہوم اخذ نہیں کر سکتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بالکل واضح اور روشن ہوتا ہے۔ پیچیدگی یا الجھاؤ اسلوب میں صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب مقصد ہی میں الجھاؤ یا پیچیدگی ہو، لیکن جب خیال واضح اور قطعی ہو تو اسلوب میں قطعیت پیدا ہوتی ہے''۔[۳۱] مولانا مودودی کے ہاں لہجے کا جو اعتماد اور استحکام ہے وہ محض اس لیے ہے کہ انھوں نے جو بات بھی کی وہ اتنی مضبوط بنیادوں پر کی ہے جیسے یہی قطعی اور آخری ہو۔ آل احمد سرور نے بڑی خوب صورت بات کی ہے:

''ابہام یا اشکال الفاظ سے کم اور خیال سے زیادہ پیدا ہوتا ہے''۔[۳۲] ڈاکٹر عطش درانی نے مولانا مودودی کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے:

''سید مودودی کی نثر کی سب سے بڑی خوبی اس کی قطعیت اور وضاحت ہے''۔[۳۳]

۳- استدلال

مولانا مودودی کی نثر زبردست قوتِ استدلال کی حامل ہے۔ اس کا مجموعی تاثر سلاست اور استدلال ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو ایک کل کی حیثیت میں دیکھا ہے۔ وہ برعظیم کے مسلم معاشرے کے تمام رویوں، مزاجوں اور رجحانات کے مقابل ایک نئی فکر، نیا انداز اور نیا نقشہ لے کر آئے تھے۔ انھوں نے لکھنا شروع کیا تو

پوری دنیا پر مغرب کی علمیت اور سائنس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، فلسفہ وعقل کی تمام شعبہ ہائے زندگی پر حکم رانی تھی اور نئی نسل اس سے مرعوب ہو چکی تھی۔ وہ مغربی فلسفے اور سائنس کے مطالعے کے سبب استدلالی نثر کی قائل تھی اور ہر بات دلیل کے ساتھ سننا، سمجھنا اور قبول کرنا چاہتی تھی۔ مولانا مودودی سے قبل سرسید، حالی، شبلی اور ابوالکلام کے ہاں بھی استدلالی اسلوب موجود ہے، لیکن: ''شبلی کے ہاں منطقیانہ رنگ نے مناظرہ، ہیجان اور جوش وخروش کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ابوالکلام کے ہاں یہ فلسفیانہ صورت میں ملتی ہے، جب کہ سرسید کے ہاں کرختگی ہے، ان کا منطقی استدلال انتہائی سخت ہوتا ہے۔ سید مودودی کے ہاں منطق، ادق مسائل کا سلسلہ جواب در جواب نہیں، بلکہ عام فہم اور سادہ ہے، اس لیے ان کی تحریروں میں ہیجانی اور بحرانی کیفیت نہیں'' [۳۴]

منطقی طرز استدلال میں بات دلائل سے کی جاتی ہے۔ سید مودودی کی تحریر میں دلائل اور منطقیت کی گرفت مضبوط ہے۔ یہ نہ شاعرانہ ہے نہ مناظرانہ، اس لیے کہ ان کے ذہنی تموّجات ان کے استدلال کے تابع ہیں اور خیال دھیمے پن کی خوبی سے آراستہ ہوتا ہے۔ مرزا ادیب کے الفاظ میں: ''انھوں نے کسی دقیق مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے ادبی لطافتوں کو قربان نہیں کیا۔ ان کے ہاں دلائل کی منطقیت اور ادب کی چاشنی دونوں چیزیں اس انداز سے ہم آہنگ ہوتی ہیں کہ امتیاز کرنا مشکل ہے''۔ [۳۵]

۴- اعتدال

مولانا مودودی اعتدال اسلوب کے لیے اپنے جذبات پر بند باندھ دیتے ہیں۔ جذبات نگاری کے لیے وہ زبان کے چٹخارے کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں: ''مولانا مودودی اردو کے بہترین انشا پردازوں میں سے ہیں۔ وہ نہایت خوب صورت، دل کش اور دل نشین اسلوب رکھتے ہیں، جو ان کی شخصیت ہی کی طرح فکر وخیال اور حسن ادا کے توازن واعتدال کا نمونہ ہے۔ موضوع کیسا ہی نازک ہو وہ کبھی جذباتیت کو راہ نہیں دیتے'' [۳۶] ان کے خیالات اور الفاظ میں بھی

ایک تناسب پایا جاتا ہے۔ وہ مواد اور اسلوب دونوں کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ان کی اسی معتدل سوچ کا نتیجہ ہے کہ ان جیسے کثیر المطالعہ شخص کی تحریروں میں جتنی اہمیت مواد کو ہے اتنی ہی اسلوب کو حاصل ہے۔ اِسی خوبی نے ان کے اسلوب میں رنگارنگی، تنوع، اخلاص اور بے ساختگی کی خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔

مولانا نے علمی مضامین کے لیے بھی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی، لیکن ان کی سادگی محض سادگی نہیں، بلکہ انھوں نے معناً پرشکوہ اور لفظاً سلیس و سادہ طرز بیان اختیار کیا۔ انھوں نے بھاری بھرکم مطالب بیان کیے، مگر انھیں بالکل عام فہم بنا دیا۔ ان کی پرورش دادہ زبان 'اردوئے مبین' ہے''۔ [۳۷]

مولانا مودودی کے اسلوب کی سادگی ادبیت اور علمیت کے ساتھ مل کر نثر کا ایسا عمدہ نمونہ تخلیق کرتی ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''عموماً اہل علم جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی تحریریں بھاری بھرکم الفاظ وتراکیب اور ادق اصطلاحات وتشبیہات کے باعث عام ادراک وفہم سے بالاتر ہو جاتی ہیں، یا پھر ادبیت کی چاشنی ان میں اتنی شامل ہو جاتی ہے کہ موضوع کی لطافت اس سے متاثر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مولانا کی تحریر میں یہ خوبی ہے کہ وہ خالص علمی وفکری موضوعات پر بھی جب قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا وہ مخصوص انداز قائم رہتا ہے جس سے اہل علم بھی استفادہ کر سکتے ہیں اور عام پڑھا لکھا آدمی بھی''۔ [۳۸]

مولانا مودودی کا اسلوب قاری کے دل و دماغ میں ایک مسرت، ایک بصیرت، ایک شادمانی، ایک انبساط، ایک طمانیت، ایک لطافت اور ایک روشنی پیدا کر دیتا ہے۔ اسلوب کی یہ روشنی دل و دماغ میں جوش، ولولہ اور تحرک پیدا کر کے جذبۂ عمل پر ابھارتی ہے۔ ان کا اسلوب اپنے اندر بہت سے پہلوؤں سے انفرادیت رکھتا ہے۔ اس میں استدلال، قطعیت، مقصدیت، متانت، سنجیدگی، اعتدال، سلاست، شگفتگی، تازگی، ندرت اور ادیبانہ شان موجود ہے۔ موضوعات اور اسلوب میں تنوع نے ان کے ہاں رنگارنگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ادبی محاسن اپنی بہار دکھاتے ہیں تو یہ اسلوب آفاقیت

اور عالمگیریت میں ڈھل جاتا ہے۔موضوع اور اسلوب میں خوب صورت ربط نے ان کی تحریروں کو جذبہ، حسن اور رعنائی عطا کی ہے۔ان کے ہاں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں، جس سے موضوع کو بھی تابندگی ملتی ہے اور اسلوب کو بھی اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے ماہرالقادری نے کہا ہے: ''اردو زبان میں مولانا کی تحریروں پر ادب عالیہ کا اطلاق ہوتا ہے۔فکر بھی بلند اور اسلوبِ اظہار بھی حسین''۔۳۹

مولانا مودودی کے اسلوب میں حقیقت نگاری، تنوع، شگفتگی، مزاح، طنز، شوخی اور جزئیات نگاری جیسی خوبیاں شامل ہیں۔اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔اس نے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کی سوچ، فکر اور شخصیت کو متاثر کیا ہے اور انھیں بدل کر رکھ دیا ہے۔زندہ، جان دار اور آفاقی اسلوب کی یہی پہچان ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، اوراق، لاہور، بہار نمبر، اپریل مئی ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۶

۲۔ اشارات تنقید، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۶

۳۔ بہ حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی، اوراق، لاہور، ص ۱۹۷

۴۔ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ، انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۱۶

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو-۱، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۹۰۰

۶۔ پروفیسر آسی ضیائی، سیارہ لاہور، جنوری، ۱۹۸۹ء، ص ۵۰

۷۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے نام ور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۴۸

۸۔ مقدمہ تقویۃ الایمان، اہل حدیث اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۸

۹۔ سیارہ لاہور، جنوری، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳

۱۰۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز و ارتقا، کریم سنز کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۳۹۳-۳۹۴

۱۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نام ور رفقا، ص ۴

۱۲ شبلی کی علمی وادبی خدمات، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۲-۱۳۳

۱۳ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نام ور رفقا، ص ۵۳-۵۴

۱۴ وثائق مودودی، ادارہ معارف اسلامی لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹

۱۵ سید مودودی اور ماہ نامہ معارف، ادارالمعارف واہ کینٹ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲

۱۶ ایضاً، ص ۸۹

۱۷ ہفت روزہ آئین لاہور، ۲۵/اگست ۱۹۸۳ء، ص ۳۱-۳۲

۱۸ المسئلۃ الشرقیہ، ادارہ معارف اسلامی لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷

۱۹ مولانا مودودی کی ادبی حیثیت، مشمولہ ادبیات مودودی، ص ۱۷۶

۲۰ پروفیسر خورشید احمد، ترجمان القرآن لاہور، مئی ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۸

۲۱ ادبی مسائل، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۷

۲۲ سیاہ لاہور، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۶۴

۲۳ تصریحات، البدر پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۵

۲۴ پروفیسر آسی ضیائی، ترجمان القرآن لاہور، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۳-۳۴

۲۵ ڈاکٹر عبدالمغنی، مولانا مودودی کی ادبی خدمات، فاران نشریات لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱

۲۶ ڈاکٹر محمد حسن رضا، مولانا مودودی کا اسلوب ایک مطالعہ، سیارہ، مارچ-اپریل ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۳

۲۷ ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۵۴

۲۸ سیارہ، اپریل-مئی ۱۹۸۰ء، ص ۶۲

۲۹ سیارہ، مئی-جون، ۱۹۸۵ء، ص ۴۶

۳۰ سید شفیق احمد، معیار، میرٹھ، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ۱۷

۳۱ پروفیسر افتخار حسین شاہ، اردو نثر نگاری کا دور بہ دور جائزہ، تحقیق مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور (غیر مطبوعہ)، ۱۹۶۳ء، ص ۲۶

۳۲ آل احمد سرور، مجموعہ تنقیدات، ص ۵۷۴

۳۳ ڈاکٹر عطش درانی، اصناف اردو کی مختصر تاریخ، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۹۷

۳۴ اعظم رضوی، سیاہ، مارچ ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۳
۳۵ سیارہ، مئی ۱۹۸۰ء، ص ۱۵۴
۳۶ سیارہ، مئی ۱۹۸۸ء، ص ۶۶
۳۷ نعیم صدیقی، المودودی، الفیصل لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۸
۳۸ سیارہ، سالنامہ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵۶
۳۹ ماہر القادری، ادبیات مودودی، ص ۱۴۴

اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم: ۴، رول: ۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی
۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری
۴۔ قومیت: ہندوستانی
پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،
پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۶۔ ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی،
پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

۱۔ مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۲- پروفیسر صدیق حسن (نائب صدر)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۳- ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکریٹری)
سی ۹، ڈوپلکس کوارٹرس، سول لائنس، علی گڑھ
۴۔ ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)
شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۵۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۶۔ مولانا محمد فاروق خاں (رکن)
۱۳۵۳ - باز ارچتلی قبر، دہلی - ۶
۷۔ جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)
مالاتھن کنڈی ہاؤس، یلیری، کالی کٹ
۸۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)
طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی
۹۔ جناب محمد جعفر (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۱۰۔ جناب نصرت علی (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۱۱۔ انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)
حیدرآباد

مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر
سید جلال الدین عمری